

مناظر احسن گیلانی

علمائے برصغیر اور مطالعہ مسیحیت

مولانا محمد احسن گیلانی - ۲

[زیر نظر مقالے کی پہلی قسط کے لیے "عالم اسلام اور عیسائیت" کا شمارہ بابت نومبر ۱۹۹۵ء ملاحظہ کیجیے۔ مدیر]

ان کل مباحث سے فارغ ہونے کے بعد آپ کی توجہ اسلام کے ان جزئی مسائل کی طرف منعطف ہوئی ہے جن سے یورپ کی ساختہ پر داخستہ جدید ذہنیت و حقیقت کو خواہ مخواہ دکھ پہنچتا ہے، یا پہنچ سکتا ہے۔ ان تمام مباحث میں آپ نے خصوصیت کے ساتھ دو باتوں کا التزام کیا ہے۔

(۱) یورپ کے ۸۰ فیصد باشندے جس مذہب کو اپنی زندگی کا آئین و دین بنائے ہوئے ہیں، اُسی پر جیسا اور اُسی پر مرنا چاہتے ہیں، خود اس مذہب میں ان مسائل کے متعلق کس قسم کے احکام اور معلومات ہیں، اس سے بڑا مقصد آپ کا اُن پادریوں اور باشندگان یورپ کو شرم دلانا ہے جو اسلام پر منہ آتے ہیں، حالانکہ وہ ساری نکتہ چینیاں خود اس دین پر ایک ایک کر کے منطبق ہیں۔ جسے انھوں نے اپنا دین بنا رکھا ہے، اس قسم کی باتوں کے بعد آپ نے لکھا ہے، اور ہالکھا ہوا ہے کہ "وہی حضرت عیسیٰ کی بات پوری ہوئی کہ اپنی آنکھ کی شبیر نہیں دیکھتے ہو اور بیگانہ کی آنکھ کا تنکنا دیکھتے ہو۔"

(۲) جن مسائل کے متعلق دعویٰ کیا جا رہا ہو کہ انسانی عقل و فطرت پر وہ گراں ہیں، گرانی کا یہ افسانہ آیا واقعی ہے یا صرف یورپ کے منہ زوروں، قلم کے ہالاک دستوں، کلیسیاء کے دشمنوں کے انتہا پسند گروہ کے فقط شور و غوغا، جہل و مشاغبہ سے یہ وہم پیدا ہو گیا ہے؟

آپ نے براہیے سوال کو جہاں تک اس زمانہ میں رسائی ممکن تھی، اٹھایا ہے، اور ان ہی دونوں اصول کے ماتحت سب کے ایسے جوابات دیے ہیں کہ بلابالغہ کہا جاسکتا ہے کہ آج تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ایک بڑا کارآمد اور قیمتی حصہ اس کتاب میں آگیا ہے، نمونہ کے لیے چند مسائل کا ذکر کرتا ہوں۔

اس ذیل میں آپ نے مسئلہ تقدیر، جسمانی دوزخ اور جنت، تعدد از دوا وج رسول اللہ ﷺ، ایمان و عمل کے نتائج، اور ان کے امتیازات، حقیقتِ عبادات، قانونِ مغفرت کی تحریر، زمین کے قطبی علاقے

جہاں دن رات مینوں دراز ہوجاتے ہیں، وہاں نماز و روزہ کی ادائی کی شکل، ذوالقرنین کے قرآنی قصہ میں آکتاب کے چشمہ میں غروب ہونے کی نوعیت، مسئلہ نسخ ادیان، مسئلہ جہاد کی حقیقت، اسلام اور تلوار کا تعلق، قاتلون قتل مرتد، اشاعت اسلام کے اسباب، اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں اصلی فرق، آنحضرت ﷺ کے متعلق بائبل کی پیشین گوئیاں، خود آنحضرت ﷺ کی وہ پیشین گوئیاں جو اُس وقت تک پوری ہوتی جائیں گی، آپ کے معجزات وغیرہ۔

تعارف و تبصرہ کے کسی مضمون میں مشکل ہے، کہ ان تمام مباحث کا استقصاء کیا جائے، جو اس کتاب میں درج ہیں، تاہم بطور نمونہ کتاب کی چند اہم باتوں سے ناظرین کو محروم رکھنا بھی ایک کظم ہے۔

مسئلہ تقدیر

حسب دستور اس مسئلہ کے متعلق مغربی مذاہب یعنی یہودیت و نصرانیت کی مستند کتابوں سے ان شہادتوں کا انبار لگا دیا ہے، جن سے مسئلہ تقدیر ثابت ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا کون سا مذہب یا دھرم ایسا ہے جس میں فطرت کے اس اٹل قانون کی تعلیم نہیں دی گئی ہے، پھر تحقیقی طور پر اس مسئلہ کی تقریر کی ہے، فرماتے ہیں۔

آیتوں اور حدیثوں کے جمع کرنے سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک تقدیر کا مسئلہ اور دوسرے یہ کہ آدمیوں کے افعال پر مشیت الہیٰ ظہور میں آتے ہیں۔

آپ نے ان دونوں مسئلوں کو الگ الگ مسئلہ قرار دیا ہے پہلے مسئلہ تقدیر کتنے صاف اور واضح لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

سو تقدیر کے معنی ہمارے اصول میں یہ ہیں، کہ جو کچھ عالم ظہور میں نمودار ہوتا ہے، منجملہ جواہر ہو، خواہ منجملہ اعراض، سب کا انداز ظہور کا یعنی یہ کہ کیا؟ کون؟ کیسا؟ کتنا؟ اور کب؟ وغیرہ لوازم ظہور ازل سے خداوند تعالیٰ کے علم میں داخل ہے، کہ سرموس کے خلاف ظہور میں نہیں آسکتا ہے، اور جو چیز جس انداز سے ظاہر ہوتی ہے، وہ خداوند تعالیٰ کے سابقہ علم ازل سے باہر نہیں ہو سکتی، جو کچھ اے معلوم ہے، اس کا ظہور اوس کی نسبت ہوتا ہے، یعنی اگر وہ چاہتا ہے، تو ظاہر ہوتا ہے، اور اگر نہیں چاہتا تو نہیں ظاہر ہوتا۔

گویا آپ کے نزدیک تقدیر کا منکر وہی ہو سکتا ہے، جو عالم کو بجائے خدا نے علام الغیوب کے مادہ اور اس کے قوانین کا مظہر سمجھتا ہے، یا جو سمجھتے ہیں کہ خدا نے عالم کو بغیر کسی سابقہ پروگرام کے بنایا ہے، ان کے نزدیک اپنے لفظوں میں "خدا خیر مال اندیش ٹھہرے گا۔"

یعنی کم از کم منکر تقدیر کے لیے یہ تو ناگزیر ہے کہ عالم اور اس کے تقاضا کو کسی غیر مال اندیش کا کارنامہ قرار دے، حالانکہ خدا اور "غیر مال اندیش" دونوں متضاد باتیں ہیں، اس کے بعد دوسرے مسئلہ کی تصریح ان لفظوں میں فرماتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ مشیت، سوہارے اصول میں اس طرح پر ہے کہ معلومات حضرت حق جل و علا کا عموماً نہیں ہوتا، مگر بموجب اوس کے ارادے کے نہ کہ کسی اور کے ارادے سے۔ مطلب یہ ہے کہ جب افعال انسانی بھی معلومات حق میں ہیں، اس لیے ان کا عموماً بھی بغیر ارادۂ حق کے نہیں ہو سکتا، لیکن پھر بالاتفاق انسان کو اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار فطرۃً، قانوناً، شرعاً کیوں قرار دیا جاتا ہے۔ اس باریک مسئلہ کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں۔

اور جس چیز کو خداوند تعالیٰ نے عرصہ عموماً میں ذی علم اور صاحب ارادہ بنایا ہے، مثلاً انسان کو سو اوس کے ارادے کے آثار نہیں متفرع ہوتے ہیں، اس طرح پر کہ اس میں ارادۂ الہی کو دخل نہ ہو۔

لیکن انسانی ارادہ کے ساتھ ارادۂ الہی کس طرح دخل ہے، اس کا حل مقفاً نہ اور گھرے لفظوں میں پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں۔

جس طرح انسان کی ہستی حدوثاً و بقاؤ ہر اکں حضرت وجود واجب کے فیض ارادی کی محتاج ہے، اسی طرح انسان کے خواص و لوازم کے آثار بھی حدوثاً و بقاؤ اسی کے فیض کے محتاج ہیں، اور انسان جو مکلف بالشرع ہے، اسی ذی علم والا ارادہ ہونے سے اور اسی جہت سے مستحق ثواب و عذاب ہوا کرتا ہے۔

کم از کم میرے علم و تحقیق میں نہ صرف اردو بلکہ عربی کی بھی کسی کتاب میں اس ڈولیدہ اور عمیق مسئلہ کی اتنی اچھی تعبیر نظر سے نہیں گزری، لیکن افسوس ہے، کہ آپ نے اجمال سے کام لیا ہے، خواص تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کی گہرائیوں تک پہنچ جائیں گے، لیکن عوام کے لیے تصریح کی ضرورت تھی، --- خود مولانا اپنی اس بحث کو ختم کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

اگر اس مسئلہ کی دقت کا لحاظ نہ ہوتا، تو بحول اللہ و قوتہ و بہ تصدق لعین مقدسہ غلامانِ شاہنشاہ دو جہاں حضرت سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کے اس مقام پر اس کے ثبوت کی دلیلیں ایسے وضع پر لکھتا کہ سننے والوں کو خدا چاہتا تو مرزا ملتا۔

اسلام اور تلوار

مسئلہ کا ذکر چھیڑتے ہوئے پہلے ایک تاریخی شہادت ادا کرتے ہیں۔
پادری لوگ عوام مسلمانوں اور اپنے تابعداروں اور ہندوؤں کو اکثر مسئلہ جہاد کو بہ ہتھارے

رنگ بیان کر کے دین اسلام سے بیزار کرتے ہیں، اور عجیب و غریب مطالبے دیا کرتے ہیں۔

آج ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے ائمہ "اسلام بزور شمشیر پھیلا" کا جوش و خروش ہے، اسلام کی سیاسی تاریخوں کے متعلق عام مسلمانوں کو کالہوں اور اسکولوں کے قند انگیز گمراہ کن نصاب سے جو شکوہ ہے، ایک صد سالہ مؤرخ کی اس عینی شہادت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کہ یہ شوشہ ابتداءً کن لوگوں کا چھوڑا ہوا ہے۔ اس مخالفہ کے چہرہ پر ہٹاریکل ریسرچ اور تحقیقات وغیرہ الفاظ کے غارے کس طرح ملے جا رہے ہیں، ہندوؤں اور انگریزوں کے تابعداروں کا خیال کر کے آپ نے اس مسئلہ کے متعلق خلاف دستور علاوہ مغربی مذاہب (یسودت و نصرانیت) کے مشرقی ادیان ہندو اور پارسی مذہب کی کتابوں سے بھی ان شادقوں کو جمع کیا ہے، جس میں اس مسئلہ کا ذکر قانوناً و عملاً زور شد سے کیا گیا ہے، اور آخر میں بائبل کے ایسے دفعات مثلاً

تم یہ سلوک کرو کہ ان کے مذہبوں کو ڈھاؤ اور ان کے بتوں کو توڑو، ان کے باغلوں کاٹ ڈالو اور ان کی تراش ہوئی مورتوں کو آگ میں جلاؤ۔ جتنی لڑکیاں ہیں، سب کو قتل کر دو۔۔۔ لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کے ساتھ سونا سنیں جاتی ہیں، انہیں اپنے لیے رہنے

دو۔

اس کے بعد آپ نے مسیحی یورپ سے یوں دریافت کیا ہے۔

اس پر ہمارے یہاں کے مسئلہ جہاد پر ہنسنا کتنی نا انصافی ہے، اگر ملحدو بے دین ہنسے تو ہنسے، عیسائیوں کو کوئی طعن کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

اس کے بعد انہوں نے پوچھا ہے کہ اسلام اور تلوار کے افسانے کو اس بلند آہنگی سے اچھالنے کا مقصد کیا ہے، اگر یہ غرض ہے کہ چونکہ اسلام تلوار سے پھیلا، اس لیے وہ باطل ہے، تو پھر اس کا دوسرا پہلو یہ پیدا ہوتا ہے، کہ جتنے خرافات، بدعادات، اہام و رسوم جو دنیا میں بغیر تلوار کی مدد کے پھیل جاتے ہیں، اور آئے دن پھیلے رہتے ہیں، یہ سب حق و راست ہوں۔ فرماتے ہیں۔

اگر یہی مطلب ہے تو مضمض بھوٹ ہے، کیونکہ اگر یہ بات سچ کہی جائے، تو چاہیے کہ

اگلے عربوں کو بت پرستی اور اسی طرح انگلستان کی بت پرستیاں اور ہندوستان کی۔۔۔

یہ سب مذہب حق ٹھہریں۔

ان جڑی اُھور کے ساتھ آپ نے نفس مسئلہ پر ایک ایسی دل نشین تقریر فرمائی ہے، جس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ آپ کا مخصوص حصہ ہے۔

مسئلہ جماد کی نوعیت

آپ کے خیال میں اسلامی جماد کی ابتداء بھی تبلیغ سے ہوتی ہے، اور اس کی انتہاء بھی تبلیغ ہی پر ہے، البتہ تبلیغی آواز میں زور پہنچانے یا حق و صدق کا آزاد تجربہ کرانے کے لیے بسا اوقات ضرورت ہوتی ہے کہ اصلاحی آواز کے ساتھ جو قوم مخاطب کی جائے، وہ اپنی قومی سطوت، صنفی وجاہت کی انانیت و نفوت کی تلاش سے پاک ہو فرماتے ہیں۔

باتفاق اہل تجربہ بدیسی الثبوت ہے کہ آدمی کو اپنے خلاف طبع بہ نسبت امور مخصوصہ اپنے صنف کے دوسرے کی بات نہ ماننے کا بڑا سبب اکثر اپنے صنف کی وجاہت اور سطوت واقع ہوا کرتا ہے، کہ اس وجاہت و سطوت کے سبب سے دوسرے خیر صنف کی بات پر کان دھرنے کو تنگ و عار جانتا ہے، چہ جائے کہ اس کو قہل کرنا، کہ یہ بات تو بہت دور ہے، اور جب تک جی لگا کر سنے گا نہیں تو ماننے کی نوبت کا ہے کو آئے گی۔ پھر جس طرح تجربی طور پر یہ ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضرور ہے کہ

اپنے خلاف طبع امور مخصوصہ صنفیہ کی مخالف باتیں دوسرے کے کان رکھ کر سننا اس کا بڑا باعث قوی، کوئی مثل غلبہ وجاہت اور سطوت صنفیہ اس کے بھننے والے کی بھی ہے۔

ان چند مقدمات کے بعد آپ نے نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام کفر کے مقابلہ میں کرہ زمین میں اگر اپنی سیاسی برتری کا خواہاں ہے، تو کیا تبلیغ و دعوت کی آواز کو موثر بنانے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے؟ باقی دشمنوں کا یہ مشورہ کرنا کہ اسلام میں لوگوں کو بزور شمشیر مذہب بدلنے یا دوسرے لفظوں میں متفق بننے پر مجبور کیا جاتا ہے، اس کی سختی کے ساتھ تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اگر تجھیے کہ بعضے جبارہ ملوک اسلامیہ نے کسی جگہ بطور اکراہ کے شمشیر زنی کی تو اوّل اس کا ثبوت چاہیے، علاوہ بریں اگر کسی نے کی تو غال غال ہمیں اتفاقاً برسمیل عدوت کی ہو، مہذا اس شمشیر زنی سے کچھ دین نہیں پھیلا، جیسا خلفائے راشدین اور اولاد کے تابعین بالاحسان کے ہاتھ سے پھیلا، پس جبارہ کے اکراہ کرنے سے اصل دین باطل نہیں ہوتا۔

پھر سیاسی برتری حاصل کر لینے کے بعد اسلام اپنے فرض تبلیغ کو کسی طرح ادا کرتا ہے، اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

اور سطوت و فرمانروائی کی جنت سے دین کا پھیلاؤ طرح سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ اہل حکومت کی فروتنی اور مروت و سخاوت، اور عدم تنگ گیری اور تہذیب اخلاق اور حسن احوال اور زہد اور بزرگیاں باعث ہوتی ہیں، جیسا کہ ہمارے یہاں پہلے طبقہ واول کے ہاتھ

سے ہوا، جوں جوں ان کے آثار کم ہوتے گئے، دین کی ترویج کم ہوتی گئی۔
بعد کے خلفاء اور سلاطین نے جو قیصری و کسروی رنگ اختیار کر لیا تھا، اس پر افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے بعد اشاعت اسلام کا مرکز قتل ہائے سلطنت کے زور کے بزرگوں کی روحانی و اخلاقی قوت کی طرف منتقل ہو گیا۔ فرماتے ہیں۔
گو کہ سطوت اور طعشق ظاہری جبر و قہر مسلمانوں کا بڑھتا گیا، اور بعد اس زمانہ کے جو پھیلا تو اکثر بزرگوں کی کرامتوں سے پھیلا۔

بہر حال یوں مسئلہ جہاد کی ابتداء اور اس کی انتہاء دونوں آپ کے خیال میں تبلیغ و دعوت ہی پر ختم ہوتی ہے، اسلامی سیاست کے ان دونوں نتائج کو دکھانے کے بعد آخر میں آپ کی نگاہ مغربی سیاست کے ان آثار و نتائج پر بھی پڑتی ہے جو محکوم قوموں میں سیاسی برتری کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں، لیکن ان دونوں کے طریقہ تاثر میں جو امتیازی فرق ہے، اُس کو چند لفظوں میں عجیب طرح سے ادا کرتے ہیں۔

دوسری طرح (یعنی تفوق کا اثر دوسری طرح یوں بھی) ہوتا ہے، کہ تنگی معاش رعایا، اور ترغ حکام، اور زرخشی ماحکم کے باعث ہو۔

کیا آج مغربی سیاست کا یہ نظام کہ عام رعایا کی دولت کو مختلف ٹیکوں، بلکہ عجیب و غریب ہشکندوں سے اس طرح چوس لیا جائے، کہ وہ کبھی پنپنے نہ پائے، سول حکام عام رعایا سے اس طرح کنارہ کنارہ رہیں جس طرح آدمی جانوروں بلکہ ناپاک جانوروں سے دور دور رہتا ہے، اُس کے ساتھ ساتھ یہ آہنی قانون بھی نافذ کر دیا جائے، کہ ملک کا ہر وہ باشندہ جو مغربی تہذیب و تمدن کی بھاٹ خوان یونیورسٹیوں، اسکولوں کالجوں کی سند نہیں رکھتا، خواہ کسی دل و دماغ سلیقہ و قابلیت کا مالک کیوں نہ ہو، رزق کے وہ تمام دروازے عزت کے وہ تمام ابواب جو سلطنت نے کھول رکھے ہیں، اُس پر بند کر دیے جائیں گے۔

سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر اس سسٹم کو آج مغربی سلطنتیں اپنی حکومت کے اندر سے نکال دیں، تو کیا رعایا کا کوئی فرد بھی ان کی تہذیب و تمدن و معاشرت اور عقلیت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتا ہے۔ اونچی اونچی لمبی دلکش و لظرف بہ عمارتوں، قیمتی اور دیدہ زیب فرنیچروں کے اندر کروڑا روپیہ کے مصارف سے ملک کے طول و عرض میں یہ کام ہو رہا ہے، لیکن شاید دس فی صد سے زیادہ آدمی بھی متاثر نہیں ہو سکے ہیں، اور وہ بھی جو ہو رہے ہیں، اُن کے متعلق مولانا نجار شاد فرماتے ہیں۔

سوائے ان لوگوں کے جو تنگے بھوکے بہت رہے، اور ابواب معیشت کے ان پر بند ہوئے۔

جزیہ

اس ذیل میں آپ نے جزیہ کا بھی ذکر کیا ہے، آپ کے نزدیک جزیہ حکومتوں کا انکم ٹیکس ہے، جو مسلمانوں کے اموال پر برہمی بھاری بھاری رقوم کی شکل میں زکوٰۃ و حشر کے نام سے عائد کیا جاتا ہے، لیکن غیر مسلحوں پر اس ٹیکس کو نہایت حقیر رقم کی صورت میں اس لیے لگایا جاتا ہے، تاکہ دینے والے کو اپنے سیاسی صف و حقارت کا احساس اور مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا اندازہ ہو سکے، اور اسلام اپنی تبلیغی غرض کے لیے اس احساس کو زندہ رکھنا چاہتا ہے، آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

جو کب و عمل کی طاقت نہ رکھتا ہو، اُس سے کچھ بھی نہیں، پھر ملک کے جو باشندے کھاتے کھاتے ہیں، تو مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کی مغلوبیت کے اظہار کے لیے فی نفر چند روپیہ سالانہ حسب استطاعت حتیٰ کہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، (مثلاً راجہ مہراج نائب نواب کیوں نہ ہو) تو تیرہ روپیہ کئی آنہ سے زیادہ نہ ہو، مقرر کروالینا چاہیے۔

قطب شمالی و جنوبی میں نماز روزہ کی بحث

حسب دستور یورپ کے اس مشہور طفلانہ مغالطہ کے متعلق آپ نے پوچھا ہے، کہ کیا یہ سوال صرف اسلام کی نماز روزوں کے متعلق پیدا ہوتا ہے، آخر موقت پوجا پاٹ، نماز روزہ کس مذہب میں نہیں۔ خود یورپ کے مسیحی مذہب میں کیا نماز روزہ نہیں ہے اور اگرچہ اب نماز کی حقیقت عیسائیت میں صرف یہ رہ گئی ہو کہ

آٹھویں روز بے طہارت ایک وقت یہ دعا مانگیں کہ "اے عیسیٰ! ہمارے خدا پھر دنیا میں ظاہر ہو۔ مگر روزہ تو با اتفاق اس کا نام تھا کہ دن بھر کے کھانے پینے اور عورت کی صحبت سے علیحدہ رہنا یہ تواتر ثابت ہے، کہ عیسائی بھی اس روزہ کو رکھتے تھے، سو دیکھیے کہ حوالی قطب والے کسی طرح عیسائی نہیں ہو سکتے۔

مطلب یہ ہے کہ جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوگی، وہاں آٹھ دن میں ایک وقت وغیرہ کے کیا معنی ہو سکتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب اس قسم کی وقتی عبادتوں کے متعلق جو جواب دیں گے، وہی اسلام دے گا، پھر اسلام کی طرف سے ایک معقنہ تقرر فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

ایسے اعتراضوں کا اصلی مادہ یہ ہے کہ تعمیل بعض احکام شرعیہ میں بعض اوقات کچھ عذرات درپیش ہو جاتے ہیں، اور یہ بات کہ بروقت لاحق ہونے ان عذروں کے کیا کرنا چاہیے، ان حکموں کے ساتھ مفسر آئمہ خصوص نہیں ہوتے، سو یہ معاملہ شریعت اسلامیہ ہی

میں نہیں ہے، بلکہ تورات و انجیل کے احکام میں بھی یہی حال ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں، ایک حوالی قطب کا عذر کیا ہے، ایسے عذر بکثرت ہوتے ہیں۔ مثلاً خوف حدوث مرض، یا سخت مرض اور نقصان بدن، مثلاً اندھا ہونا اور سو خفا یا لسیان اور قصان مال اور افلاس شدید اور خوف دشمن یا ہرن و غیرہ از باب تعذرات۔ اس کے بعدہ کرہ زمین کا آپ نے نقشہ بتایا ہے جس میں طول البلد، عرض البلد کے لحاظ سے دکھایا گیا ہے کہ آفتاب کی شعاعیں کن علاقوں میں کس طرح پر کتنی مدت تک پڑتی ہیں، اور سورج کی کرنوں کی ان مختلف سمتوں کا اثر زمین کے کس قطر پر کیا مرتب ہوتا ہے، بحث کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اور مبرکہ (یعنی سرد علاق) اس حصہ کو کہتے ہیں، جو ایک جانب جنوب و شمال میں دائرہ قطبیہ کے اندر ہے، اور دائرہ قطبیہ خط استواء سے ساڑھے چھیاٹھ درجے یعنی ہمارے کوسوں کے حساب سے تحدیداً دو ہزار ایک سو اٹھائیس پر ہے، اور سب اہل جغرافیہ قدیم و جدید بالاتفاق لکھتے ہیں، کہ مبرکہ حصول پر شعاعیں آفتاب کی جب پڑتی ہیں، تو ایسی ترچھی پڑتی ہیں، جیسے ہمارے ملکوں میں ہاڑوں میں تین چار گھنٹی دن چڑھے تک پڑتی ہیں، سو اس جہت سے وہاں کا برف کبھی پانی نہیں ہونے پاتا ہے، بالجلہ ساڑھے چھیاٹھ درجے سے پرے بلکہ وہاں تک بھی برف باری ایسی ہمیشہ برابر رہتی ہے کہ آدمی وہاں نہیں گھر بنا سکتا۔

لیکن اگر قسمت کا مارا کسی طرح ان علاقوں میں پہنچ جائے، تو یہ عذر کی صورت ہے، اور اسلام کا فتویٰ اس عذر کے پیش آ جانے پر آپ کے نزدیک یہ ہے۔

وے لوگ جو ایسی جگہوں میں رہتے ہیں، دنوں اور راتوں کی چوبیس گھنٹوں پر تقسیم کر کے بارہ گھنٹے کی رات اور بارہ گھنٹے کا دن قرار دے کر نمازیں لہنی چوبیس گھنٹوں میں پانچ وقت کی ادا کریں۔

پھر روزے کے متعلق فرماتے ہیں۔

جواب اس کا بھی وہی ہے جو میں نے اوپر نمازوں کے ادا کرنے کی نسبت لکھا۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس قسم کی استثنائی شکلیں دنیا کے تمام قوانین و شرائع میں پیش آتی ہیں،

لیکن

فرق اتنا ہے کہ شریعت اسلامیہ میں از روے کسی حجت کے منجملہ جہتائے اربعہ اجمالاً، تفصیلاً اور کلیتہً یا جزئیہً کوئی نہ کوئی بات ایسی مقرر ہے کہ جس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے، کہ بروقت پیش آنے والے ان عذروں کا کیا کرنا چاہیے، بخلاف تورات و انجیل

کے اس میں سے ایسا کچھ نہیں نکلتا۔

مولانا نے جو کچھ لکھا ہے، اس مسئلہ کا جواب جسے فقہ کی کتابوں سے مولانا نے نقل کیا ہے، اس کی بنیاد دجال کی اس مشہور حدیث پر مبنی ہے، جس میں پیشین گوئی کی گئی تھی، کہ ایک دن چالیس دنوں کے برابر جوہانے گا، تو صحابہ کے یہ پوچھنے پر کہ نمازیں کس طرح پڑھی جائے گی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اندازہ کر لینا" مولانا نے اسی اندازہ کی تصریح کرتے ہوئے "دفعہ اور احوال کو چوبیس محفظوں پر تقسیم کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور اندازہ کی یہ بہترین شکل ہے۔

مضون طویل ہوا جا رہا ہے اور کتاب کے لطائف ختم ہی ہونے کو نہیں آتے، خصوصاً یہ خیال کر کے کہ خدا جانے کتاب کی اشاعت کی نوبت آتی ہے یا نہیں، جی سی چاہتا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کتاب کی نادر مفید باتیں اس مضون کے ضمن میں آجائیں، لیکن مستقل رسالہ ہوا جاتا ہے، اس لیے صرف اسلامی "بہشت و دوزخ" کی بحث میں سے کتاب کے ایک فقرہ کو درج کر کے ناظرین کو اصل کتاب کی ضرورت و طاعت کا مستقر بناتے ہوئے مضون کو ختم کر دیتا ہوں۔

اسلامی بہشت و دوزخ کا عقیدہ

جس طرح ہندو مذہب میں پانی انسان کی آخری سزا یہ سمجھی جاتی ہے کہ آدمی بھائے آدمی ہونے کے بیل یا گھوڑا، سور، بندر، جوہاتا ہے، یعنی بقول کارلائل انسان کی غیر تشریف یافتہ فطرت سزا بھگتنے کے لیے تشریف یافتہ جانوروں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اسی طرح عیسائیوں کا خیال ہے کہ آدمی نیکیوں کی بدولت آدمی نہیں رہتا، بلکہ بھائے آدمی کے فرشتہ جوہاتا ہے یا دوسرے لفظوں میں خدا کا العام انسان کو اس شکل میں ملتا ہے کہ انسانیت کے تمام نازک احساسات، لطیف جذبات کچل کر برباد کر دیے جاتے ہیں۔ عیسائیوں کے خیال میں جتنی آدمی اسی لندمنڈ مغیر حساس زندہ وجود کا نام ہے، انجیل کی ایک آیت سے عیسائیوں کو یہ مغالطہ ہوا۔ کریلانیم پر اس کے بعد اور بھی چڑھ گیا، کہ یہودیت و مسیحیت میں خدا جانے کیوں، عورت گناہ، پاپ، گندگی، نہاست اور آلودگی کے ہم معنی خیال کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد بہشت کے پاک علاقے میں گندگی کا تخیل عیسائیوں کے لیے سنت و شوار تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن نے جب انسانی سماعت کے آخری غیر مقتم سنج کی حقیقت کو واضح کاف کرتے ہوئے بتایا کہ آدمی نہ گھوڑا ہوتا ہے نہ بیل، نہ خدا، نہ فرشتہ بلکہ جو انسان ہے، وہ انسان ہی رہتا ہے، البتہ اسی کثیف انسان کو دوسری نظرات میں لطیف سے لطیف ترین درجات تک ارتقاء حاصل ہو جاتا ہے، اور درجات و احساسات کی اس ارتقائی لطافت کی مناسبت سے اُس کو وہ ساری نعمتیں قدرت اور اس کے قوانین کی طرف سے میٹا ہو جائیں گی، جنہیں لاکھوں برس سے انسان زمین کے اس کرہ پر تلاش کر رہا ہے اور ابھی تک سرگرداں ہے۔

حور و قصور، جنات و انہار ولی یہی جنت تھی، جس کا ذکر جب یوں میں پہنچا، تو پادریوں میں سخت شورش پھیلی، چونکہ اسلام انسان کی فطرت کو وہی دے رہا تھا، جو وہ مانگ رہی تھی اور سمیت اس کے مقابلہ میں انسان سے جنت میں وہ سب چیزیں چھین رہی تھی، جن کی تکمیل کے لیے نسل آدم ہمیشہ بے تاب رہی، اور آج تک بیتاب ہے۔ آخر جزاء کی اس سزائی حقیقت کے ساتھ آدمی کب تک وابستہ رہ سکتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ پادریوں نے حسب دستور پیشیناں لفظی تحریروں اور تعمیری پیسٹروں سے کام لینا شروع کیا۔ لفظ تراشا گیا کہ قرآن کی جنت حیوانی جنت ہے۔ پادریوں کا یہ ایسا مغالطہ تھا کہ اس میں اچھے سے اچھے عقل و دانش والے اپنے دماغی توازن کو کھو بیٹھے اور مذہبی و غیر مذہبی ہر قسم کی کتابوں میں اس جنت فقرہ کا اعادہ اتنے زور شور سے کیا گیا کہ خود مسلمانوں کی بھی ایک جماعت میں ترنزل پیدا ہوا، انہوں نے الفاظ کو معانی سے بے گانہ کرنا شروع کیا، اور اس درجہ بے گانہ کیا کہ قرآن میں صرف لفظی طور پر اسلامی جنت باقی رہی، ورنہ معنوی طور پر ان کے خیال میں بھی قرآن کا جنتی اچھا خاصہ لنڈ ٹنڈ بے حس عیسائی جنتی بن کر رہ گیا، مولانا کو اس آنے والے قتنہ پر خاص طور پر تنبیہ ہوئی ہے اور خاص باب اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے آپ نے لکھا ہے۔

بموت کو ختم کرتے ہوئے آخر میں کتنے لطیف و عمیق پیرایہ میں اسلامی جنت کی تصریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

عقلًا جائز اور تقلاً واجب التسليم ہے، کہ وہاں لذائذ روحانی اور جسمانی دونوں ایک ہی ہو جائیں اور ہرگز کسی طرح کی کشاکشی اور تنازع ان میں باقی نہ رہے، اور جس طرح کمال لذت جسمانی جو اسی طرح عین اسی لذت میں وہ کیفیت جو دنیا میں بڑے بڑے عارفوں کو کمال ترقی کے وقت حاصل ہوتی ہے، بوجہ احسن حاصل ہو، بلکہ اس سے مراتب زیادہ۔

لیکن بقول غالب

محرّم نہیں ہے، تو ہی نواہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کی نزاکتوں کا احساس ان کثیف و غبی فطرتوں کو کس طرح کرایا جا سکتا ہے، جنہوں نے انسانیت کے لطیف ترین حصہ کو گندگی و نہاست کا سرچشمہ قرار دیا ہو، یا انسان سے انسانی جذبات و احساسات کی بربادی کو بھائے لعنت کے رحمت اور بھائے سزا کے جزاء خیال کر لیا ہو۔

